رسائل ومسائل

سود، پردہ، طلاق اور مہر

ازجناب مولوی ابوالخیر محمد خیراللہ صاحب منصفی وکیل ہنمکنڈہ

انجمن طیلسانین جامعۂ عثمانیہ کے گذشتہ سالانہ جلسہ کی صدارت فرماتے ہوئے ڈاکٹر میر سیادت علی خان صاحب پروفیسر قانون جامعہ عثمانیہ نے اپنے خطبہ میں سود، پردہ، طلاق اور مہر کے مسائل پر جو بحث کی ہے وہ غور و توجہ کی محتاج ہے اور ضرورت ہے کہ ان مسائل پر نور قرآن و حدیث کے اجالے میں نظر ڈال کر صحیح شرعی احکام بیان کئے جائیں۔

مسئلہ سود: جناب صدر کا ارشاد ہے:-

"شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے نہایت ہی اہم موقع پر میدان عرفات میں ہزار ہا صحابیوں کے سامنے نہایت ہی اہم الفاظ میں اس کی ممانعت فرمائی کہ اَلا اِنَّ ربٰوا الجاھلیۃ ھی موضوع تحت قدمی ھذا۔ لیکن دور اول ہی سے اس کی شروعات کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً امام مالک کی مدونہ میں سود پر سینکڑوں مسائل کا ذکر ہے۔ اگر یہ سب فرضی اور قانونی نہیں ہیں بلکہ کچھ بھی واقعی تو ان سے ظاہر ہے کہ ایک نہ ایک شکل میں سود کا لین دین ہوتا تھا۔ اسی طرح امام سرخسی کی مبسوط میں صراحۃً مذکور ہے کہ حضرت ابن عباس بصرہ سے مکہ تک سفاتج (یعنی بلس آف اکسچینج یا ہنڈیوں) پر کچھ زائد لینے کو جائز سمجھتے تھے حالانکہ یہ الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ کی حدیث سے فقہاء کے نزدیک سود کی تعریف میں داخل ہے۔ دور اول کے بعد تو مسلمانوں

میں سود کا رواج عام رہا ہے۔ چنانچہ امام ابو یوسف کے متعلق قاضی خان اور دوسری فقہی کتابوں میں یہ قول منقول ہے کہ وہ حیل شرعی کے ذریعہ سے سود لینے کو پسند فرماتے تھے اور بیع بالوفا وغیرہ شرعی حیلوں کے ذریعہ سے سود کے جواز سے قطع نظر بھی کریں تو نیل الاوطار میں امام شوکانی صاف الفاظ میں شاکی نظر آتے ہیں کہ افسوس مسلمان ممالک کی مسلمان عدالتیں سود کی ڈگریاں دیتی ہیں۔ اور دیتی آئی ہیں"۔

"........مسئلہ سود کا ایک رخ مسلمانوں کے لیے بھی خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ وہ سود دیتے ہی ہیں اور سود لیتے نہیں۔ حالانکہ فقہی احکام کی رو سے سود دینا بھی اتنا شنیع ہے جتنا کہ لینا۔ اسی سود دینے کی وجہ سے سالانہ ہزارہا مسلمانوں کی لاکھوں کی جائداد بنگال، یوپی، پنجاب، بمبئی وغیرہ میں دیگر اقوام کے ہاتھوں منتقل ہوتی جارہی ہے........ یہ المناک واقعہ علمائے اسلام کی توجہ کے قابل ہے........ حلت وحرمت سود وربا کے متعلق ان کا موقف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ربا یعنی غیر پیدائشی اغراض کے لیے محتاجوں سے اضعافاً مضاعفاً سود بھی حرام ہے اور پیدائشی اغراض کے لیے بنک کا سود بھی۔ ان کو پہلی قسم کے سود کی ممانعت پر کوئی شبہ نہیں۔ دوسرے کے متعلق بھی وہ حرمت کی طرف مائل ہیں کیونکہ کاروبار میں پیدائشی اور غیر پیدائشی اغراض محتاج اور غیر محتاجوں کا فرق ممکن نہیں۔ اس شبہ پر وہ اس سود کو بھی اس بناء پر ممنوع قرار دیتے ہیں کہ سود کی وجہ سے سرمایہ چند کے ہاتھوں میں جمع ہو جاتا ہے۔ اخوت اور ہمدردی کے جذبات فنا ہو جاتے ہیں، اور نظم معاشرت میں فتور پیدا ہو جاتا ہے۔"

"شرع شریف کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ لا ینکر وا لتغیر الاحکام بتغیر الازمان

اس اصول پر عمل کر کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے طلاق السنۃ یعنی قرآن و حدیث کے مقرر کردہ طریق طلاق کو بدل کر طلاق بدعی کو رائج کر دیا جو آج تک حنفی شافعی حنبلی ممالک میں قانون ہے صحیح حدیث کی رو سے خود حضرت عمرؓ کو ربا کی وسعت اور حدود کے متعلق شبہہ رہا ہے۔ دار الامان و دار الاسلام کے مسئلہ کی بنا پر حضرت عبد العزیز دہلوی نے جواز سود کا فتویٰ دیا ہے۔ اضعافاً مضاعفاً۔ یا سود در سود کی ممانعت میں تو مضائقہ نہیں اور یہی قرآن شریف کا حکم ہے اور اس کی تحدید تو امین موضوعہ کی رو سے کافی حد تک کامیابی کے ساتھ کی جا سکتی ہے مشہور و مستند حدیث الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ الخ۔ کا صحیح منشا کیا ہے؟ کیا اس کا منشا رمبادلہ کو ختم کرنا اور اس کے بجائے بیع کا رواج دینا نہیں تھا؟ کیا اس خصوص میں آج کل کے اسلامی ممالک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مدعا پورا نہیں ہو چکا ہے؟ اور کیا نیز اس حدیث شریف کا مقصد عربستان میں ایک واحد سکہ کی ترویج نہیں تھا۔ اور کیا یہ بھی آج کل کے تمام اسلامی ممالک میں شارع اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے منشا کے مطابق ظہور پذیر نہیں ہو چکا ہے؟ اور کیا اسی لیے سود کے متعلق میدان صاف نہیں ہے تاکہ ہر اسلامی حکومت حسب مصلحت عامہ احکام وضع کرے؟ اور کیا اگر یہ توجیہیں صحیح ہیں تو علمائے کرام کو نہیں چاہیئے کہ مسلمانوں کے ضمیر سے سود کی ممانعت کے بار گراں کو اٹھالیں کم از کم عارضی طور پر مصلحت کے اصول ہی کے تحت؟ بلا تشبیہ ساری تعریف ہے علمائے کرام کے لیے کہ اپنی تجارتی دنیا آپ پیدا کرنے کی مردانہ تعلیم دیتے ہیں لیکن کیا دنیا کے معاشی حالات مسلمانوں کو اس طرح گھیر نہیں لیے ہیں کہ اس مشورہ پر عمل کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے؟ کیا آج کل کے قیامت سے قریب کے زمانہ میں مسلمان سود کے

غبار میں سرتاپا اٹے ہوئے نہیں ہیں۔"؟

اس تقریر میں حسب ذیل سوالات تنقیح طلب ہیں:۔

(۱) اس سے تو کسی کو انکار نہیں کہ شرع اسلامی میں سود حرام کیا گیا ہے مگر کیا یہ واقعہ ہے کہ شرع میں خود سود کو بلا کسی تعریف و تحدید کے یوں ہی مبہم چھوڑ دیا گیا ہے؟ اگر سود کی وسعت اور اس کے حدود ہی متعین نہیں ہیں، جیسا کہ فاضل صدر کا خیال ہے، تو شریعت کا حکم تحریم سرے سے باطل ہو جاتا ہے، اور شارع پر یہ الزام وارد ہوتا ہے کہ اس نے ایک ایسی چیز کو حرام کیا جس کے متعلق یہی معلوم نہیں کہ وہ چیز درحقیقت ہے کیا۔

(۲) اگر ایسا نہیں ہے اور "ربوا" ایک معلوم و متعین چیز ہے تو کیا شریعت میں "ربوا" صرف وہی حرام ہے جو اضعافاً مضاعفۃً ہو؟ کیا سود کی دوسری صورتوں پر "ربوا" کا اطلاق نہیں ہوتا؟

(۳) کیا یہ واقعہ ہے کہ ممالک اسلامیہ میں دور اول ہی سے سود کسی نہ کسی صورت میں رائج ہو گیا تھا اور فقہاء و مجتہدین نے مختلف حیلوں سے اس کو پسند کیا یا جائز رکھا؟

(۴) کیا تحریم ربوا کا مقصد صرف مبادلہ کو ختم کرنا اور اس کی جگہ بیع کو رواج دینا اور عرب میں ایک واحد سکہ کو جاری کرنا تھا؟ اور کیا یہ مقصد حاصل ہو جانے کے بعد اب ہر اسلامی حکومت آزاد ہے کہ سود کے متعلق مصلحت عامہ کے تحت احکام وضع کرے؟

(۵) تغیر ازمان کے ساتھ تغیر احکام کی حد کیا ہے؟ کیا تغیر زمانہ کے ساتھ اصول بھی بدلے جا سکتے ہیں؟ یا اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ اصول کے ماتحت جزئی احکام میں تغیر و تبدل ہو سکتا ہے؟

(۶) کیا موجودہ زمانہ کی معاشی مشکلات کو حل کرنے کے لیے جائز ہے کہ سود کے متعلق اسلام کے اصلی قانون میں ترمیم کی جائے؟ اگر نہیں تو اس اصلی قانون کو برقرار رکھتے ہوئے ان مشکلات

کا صحیح حل کیا ہے؟

پردہ دوسرا مسئلہ جس پر ڈاکٹر صاحب نے مذہبی حیثیت سے بحث فرمائی ہے حجاب شرعی کا مسئلہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"میری ناچیز تحقیق میں امر صاف ہے کہ پردہ قرآن و حدیث و آثار سے واجب نہیں ہے بلکہ وہ صرف رواج کی وجہ سے واجب ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کو قرآن شریف کی ایک آیت کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں جو یہ ہے کہ وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا۔ یعنی عورتوں کو نہ چاہیے کہ اپنی زینت کو ظاہر کریں سوائے اس زینت کے جو خود ظاہر ہے۔ اور تفسیر میں علامہ طبری کی تفسیر سب سے قدیم اور بہت ہی مستند ہے۔ اس میں حضرت ابن عباس کی اس آیت کی یہ تفسیر بیان کی گئی ہے کہ عورتوں کو چاہیے کہ اپنے چہرے اور ہاتھوں کے سوائے بدن کو ڈھانکے رہیں کیونکہ چہرہ اور ہاتھ ان کی ایسی زینت ہے جو خود ظاہر ہے۔ اس طرح پر ظاہر ہے کہ قرآن شریف سے پردہ کا حکم نہیں ہے۔ اور نہ میرے مطالعہ سے کوئی ایسی حدیث شریف گذری ہے جس سے پردہ کا حکم نکلتا ہو برخلاف اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے بہت سے واقعات سے ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں پردہ کا رواج نہیں تھا۔ مکہ سے مدینہ ہجرت کرنے پر آپ کی پیشوائی انصار کی لڑکیوں نے بھی طلع البدر علینا کے شہور آفاق اشعار کو پڑھتے ہوئے کی آپ کی بیعت عورتیں خود آکر کرتی تھیں اور اگر کبھی ان کا لباس باریک ہوتا تھا جس سے ان کا جسم نظر آتا تھا۔ تو آپ ان کو ایسا لباس پہننے سے منع کرتے تھے آپ کے زمانہ میں اور حضرت عمر کے زمانہ تک عورت و مرد ایک ہی صف میں نماز پڑھتے

حضرت عمر نے خیالات منتشر ہو جانے کے خیال سے حکم دیا کہ عورتوں کی صفیں مردوں کے پیچھے رہیں۔ مراسم حج میں یہ بھی آج تک بھی ضروری ہے کہ میدان عرفات میں عورتیں بے نقاب کھڑی رہیں۔ ان تمام واقعات و دلائل سے ظاہر ہے کہ پردہ شعائر اسلام سے نہیں۔ البتہ یہ مسلمانوں کے رواج سے اور وہ بھی بعض ممالک کے رواج سے قائم ہے۔ میں آخری شخص ہوں گا جو مسلمانوں کے رواج کو قطعی طور پر برا کہوں گا اور فی الحقیقت پردہ کا رواج سرتا سر برائیوں سے بھرا ہے۔ ..... آیا پردہ تعلیم نسوان میں، عورتوں کی صحت جسمانی میں، ان کے اچھی ماں اور اچھی بیوی بننے میں مانع نہیں؟ اگر ہے اور ہم اجتماعی غور و فکر کے بعد اس کی تخفیف کو مناسب سمجھتے ہیں تو اس تخفیف کی کمیت اور کیفیت کیا ہونی چاہیئے؟ کیا اس خصوص میں ہند و عورتیں ہمیں کچھ سبق سکھا سکتی ہیں۔؟"

یہاں حسب ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کی تحقیق ضروری ہے:۔

(۱) کیا قرآن و حدیث کی رو سے پردہ واجب نہیں ہے اور شعائر اسلام سے خارج ہے؟

(۲) آیت محولہ فوق میں "زینت" کا کیا مفہوم ہے اور مَا ظَهَرَ مِنْهَا سے کیا مراد ہے؟۔

(۳) کیا عہد نبوی اور عہد صحابہ میں پردے کا رواج نہ تھا؟ اور کیا اس عہد مبارک میں عورتوں کو بے نقاب پھرنے اور مذہبی و معاشرتی اجتماعات میں مردوں کے ساتھ آزادانہ میل جول رکھنے کی اجازت تھی؟۔

۴۔ کیا میدان عرفات میں عورتوں کا بے نقاب استادہ ہونا ضروری ہے؟

۵۔ کیا مسلمان عورتوں کے لیے جائز ہے کہ بے پردہ پھرنے میں غیر مسلم عورتوں کی تقلید کریں؟

طلاق بدعی | طلاق کے متعلق ڈاکٹر صاحب نے جن مسائل پر بحث فرمائی ہے ان میں سے پہلا

مسئلہ طلاق بدعی (یعنی بیک وقت تین طلاق دینے) کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :-

"طلاق بدعی خلاف احکام قرآن و حدیث شریف ہے۔ ہماری معاشرت کے لحاظ سے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے اس کو قانون کے ذریعہ سے منسوخ کر دینا چاہیے . . . . . طلاق بدعی کا مسلمانوں میں رواج حضرت عمر کے زمانہ میں ہوا کیونکہ آپ نے دیکھا کہ عرب اپنی غصیلی طبیعت کی وجہ سے اپنی عورتوں کو ذرا سی بات پر طلاق دیدیتے تھے اور تین مہینے ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیتے تھے لیکن دل سے نہیں بلکہ محض اس وجہ سے کہ کہیں بیوی بند نکاح سے آزاد ہو کر کسی دوسرے سے نکاح نہ کرلے۔ اس طرح پر وہ عورتوں کو معلق رکھتے تھے۔ نہ امساک بالمعروف پر عمل کرتے تھے نہ تسریح باحسان پر۔ اس لیے عورتوں کے مفاد کے مدنظر آپ نے قرار دیا کہ اگر کوئی عرب اپنی بیوی کو تین طلاق دیدے تو یہ تین طلاق فوراً ہی بائن واقع ہو جائیں گی۔ ظاہر ہے کہ مرور زمانہ سے اور اختلاف طبائع اور معاشرت کی وجہ سے طلاق بدعی کی ہمارے لیے ضرورت نہیں اور قرآن و حدیث شریف کے طریقہ طلاق کی طرف رجوع کرنے میں کوئی امر مانع نہیں"

یہ مسئلہ فقہائے کے درمیان مختلف فیہ ہے کہ اگر ایک ہی وقت میں تین طلاق دی جائیں تو یا وہ تینوں ایک طلاق قرار دی جائیں گی یا جدا جدا تین طلاق؟ اور آیا ان سے عورت اپنے شوہر سے جدا ہو جائے گی یا شوہر کو حق رجوع باقی رہے گا؟ ڈاکٹر سیادت علی صاحب اس کا قطعی تصفیہ کر دینا چاہتے ہیں اور ان کی تجویز یہ ہے کہ طلاق بدعی کو قانون کے ذریعہ سے منسوخ کر دیا جائے یعنی قانون میں یہ طے کر دیا جائے کہ بیک وقت تین طلاقین ایک ہی طلاق کے حکم میں ہونگی اور وہ طلاق بائن نہیں بلکہ رجعی ہوگی۔ لیکن ایسا فیصلہ کرنے سے پہلے مسائل ذیل کا تصفیہ ضروری ہے۔

(۱) کیا قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ طلاق بدعی سے بینونت واقع نہیں ہوتی؟

(۲) کیا حضرت عمر کو یہ حق تھا کہ جس طلاق کو خدا اور رسول نے بائن نہ قرار دیا ہو اس کو وہ اپنے

اختیار سے بائن قرار دیں؟

طلاق کو عدالتی فعل بنانے کی تجویز اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے ایک اور تجویز پیش فرمائی ہے جو انہی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:۔

"شوہر کی طاقت طلاق مطلق العنان ہے اور اس طاقت میں اس کا کوئی شریک نہیں نہ بیوی نہ قاضی نہ عدالت۔ اس کو طلاق دینے کی وجہ بتلانے کی ضرورت نہیں۔ میری دانست میں یہ امر ہم سب کے غور و توجہ کا محتاج ہے کہ کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ طلاق کو بجائے ایک شخصی فعل رہنے دینے کے ایک پنچایتی یا عدالتی فعل بنا دیا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ قرابت والوں کو نیچ بچاؤ کرنے کا موقع ملے گا اور بغیر کافی وجہ کے طلاق دینا ناممکن ہوگا"

سوال یہ ہے کہ کیا شریعت کے اصول میں اس قسم کی ترمیم کرنے کا اختیار کسی کو حاصل ہے؟ اور کیا شوہر کے اختیار طلاق پر پابندی عائد کرنا درست ہے؟

مہر کی تحدید مہر کے متعلق فاضل خطیب نے فرمایا کہ:۔

"گو مہر السنۃ پانچ سو درہم یعنی ایک قلیل رقم ہے (مگر) خصوصاً ہم ہندوستانی مسلمانوں میں بڑے بڑے مہر باندھنے کا رواج ہوگیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ طلاق کی جو مطلق العنان طاقت شوہر کو حاصل ہے اس پر ایک روک لگانے کے لیے مسلمانوں نے رواج کے ذریعہ سے یہ قانون سازی کی ہے کہ مہر بڑی بڑی مقداریں باندھے جائیں تاکہ شوہر کو اپنی مطلق العنان طاقت کا استعمال دشوار ہو جائے اور چونکہ مہر کتنا ہی زیادہ ہو شرع شریف میں اور ہندی عدالتوں میں اس کی ڈگری ہو جاتی ہے۔ چنانچہ بہت سے مقدمے ایسے ملتے ہیں جن میں لاکھوں کی ڈگری دی گئی ہے۔ اس لیے مقدار مہر کی زیادتی صحیح معنی میں طلاق کی مطلق العنان طاقت پر ایک موثر روک ہے لیکن مہر کی بے اندازہ زیادتی بنفسہٖ خرابیوں سے خالی نہیں"

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مہر کی اس زیادتی کے دو نقصان بیان فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے وارثوں کے حقوق پر زد پڑتی ہے۔ دوسرے یہ کہ شوہروں کو کاروباری دنیا میں معاشی حیثیت سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے مثلاً بینک سے اگر تجارتی اغراض کے لیے ان کو قرض لینا پڑتا ہے تو سوال کیا جاتا ہے کہ تمہارے ذمہ مہر کی رقم کس قدر واجب الادا ہے۔ اگر مہر ان کی معاشی حیثیت سے بہت زیادہ ہوتا ہے تو شرح سود بڑھا دی جاتی ہے اور بڑی بڑی کفالتیں مانگی جاتی ہیں ان نقصانات کو بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ :-

"توقع ہے کہ ہمارے ارباب حل وعقد اور ارکان مجلس قوانین قانون کے ذریعہ سے نہ صرف اس کی اصلاح کی طرف توجہ فرمائیں گے بلکہ طلاق کی بجائے شخصی فعل کے پنچایتی یا عدالتی فعل بنانے کی طرف بھی کیونکہ یہ دونوں مسئلے ایک دوسرے سے علانیہ طور پر مربوط ہیں"

اس معاملہ میں تحقیق طلب مسئلہ یہ ہے کہ ایا مہر کی زیادتی پر شرعاً کوئی پابندی عائد کی جا سکتی ہے یا نہیں ؟

ترجمان القرآن۔ چونکہ یہ سوالات تفصیلی بحث چاہتے ہیں اس لیے ان کا جواب شائع آیندہ پر ملتوی کیا جاتا ہے۔